# پچھلے پہر

جاں نثار اختر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

# پچھلے پہر

جاں نثار اختر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی
110025

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی
110006



شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی
400003

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ
202001

پہلا اڈیشن — مئی ۱۹۷۵ء — قیمت =/۷

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی میں طبع ہوئی

اندر کمار گجرال کے نام

بہت ہیں تجھ کو سیاست سے چاہنے والے
ہماری طرح کوئی تیرا جاں نثار تو ہو

جاں نثار اختر



جاں نثار اختر اِس دَور کے اُن ممتاز شاعروں میں سے ہیں جن پر ہماری شاعری اور ادب بلاشبہہ فخر کر سکتا ہے۔ اُن کے باپ مضطر خیر آبادی نے ہمارے کلاسیکل رنگ کے حُسن، رچاؤ، پختگی اور شگفتگی کو جس البیلے انداز میں اپنے اشعار میں سمو لیا تھا اُس سے ارباب نظر اچھی طرح واقف ہیں۔ جاں نثار اختر کے یہاں روایت کے صالح عناصر کی پاسداری اور عرفان کے ساتھ اِس دَور کے درد و داغ اور سوز و گداز کی جس طرح آئینہ داری کی گئی ہے وہ بڑے بڑوں کے بس کی بات نہیں۔ جاں نثار نے نئے کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی۔ مگر ان کا نیا پن نہ فیشن کے لیے ہے، نہ فارمولے کی خاطر اور نہ یہ صرف مختلف ہونے پر نازاں ہے۔ یہ مختلف بھی اور منفرد بھی اور اُس کے ساتھ اپنی پناہ میں میرؔ و غالبؔ اور حسرتؔ و اقبالؔ سبھی کو جذب کیے ہوئے ہے — ہاں اس کے ساتھ اس میں آج کی روح کا ماجرا ہے، حال کے ذہنی سفر کی داستان ہے، زندگی کے موجودہ موڑ پر انسانیت کے کرب کی کہانی ہے، دورِ حاضر کا علم ہے، اِس لمحے کا عرفان ہے، اور زندگی کی لامعنویت کے ساتھ اُس کی عظمت کا رَجز ہے۔

جاں نثار سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ میں مجازؔ نے کرائی، اُس وقت وہ اپنے باپ کے رنگ میں بڑی شوخ اور چنچل غزلیں کہتے تھے، پھر اُنھیں ماحول کا احساس ہوا اور گرد و پیش کے مسائل پر ان کی نظریں پڑنے لگیں۔ باپ سے انھیں رنگین تخیل اور رومانی فکر کی ایک دل کش روایت ملی تھی۔ پھر ترقّی پسند تحریک نے "نیکشوں کی برہمی" اور خانہ بدوشوں کی کائنات کے اسرار سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی کے

حسن کے بھی گیت گائے اور اس کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے نظمیں زیادہ لکھیں، غزلیں کم۔ نظم پر یہ توجّہ قدرتی تھی۔ اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی وجہ سے اقبالؔ اور جوشؔ کے بعد، مری نسل کے شعرا کا سرمایہ بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُس دور کا جوش و خروش اور ایمان و ایقان آج کچھ عجب سا لگتا ہے مگر وہ اُس وقت برحق تھا اور آج اُن قدروں سے بے اطمینانی بھی برحق ہے۔ وقت کا ساتھ دینا معمولی کام نہیں۔ اس میں ہر قدم پر جو زادِ راہ جمع کیا گیا تھا اُسے پھینک کر نئی بصیرت اور نیا زادِ راہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

جاں نثار اختر میرے نہایت عزیز دوست رہے ہیں۔ اُن کی بیوی مرحومہ صفیہ بھی مجھے بہت عزیز تھیں۔ اُن کی یاد میں اُنھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ فکر و فن کے ایسے مرقعے ہیں جن کی رعنائی اور لالہ کاری کبھی ماند نہیں ہو سکتی۔ اُن کے یہاں ایک شاعرانہ مزاج اور قلندرانہ انداز ہے جو اُن کی شخصیت کے کھرے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے کالج میں اُردو کی تعلیم بھی دی ہے، فلمیں بھی بنائی ہیں، ہر طرف لپکے ہیں اور ہر شعلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے، اس کے ساتھ ہاتھ اور دامن جلائے بھی ہیں۔ ہر ہوا کی موج، ہر روشنی کی کرن، ہر خوشبو کے جھونکے کے لیے دیدۂ و دل کھُلے رکھے ہیں مگر انھوں نے اپنے آپ کو کبھی کسی چوکھٹے میں اسیر نہیں کیا۔ اُن کی نگاہ منزل پر ضرور رہی ہے مگر اُس کے لیے راستہ انھوں نے خود بنایا ہے۔ انھوں نے کبھی کبھار نعرے بھی لگائے ہیں۔ مگر اُن کی شاعری نعروں کی شاعری نہیں ہے، اُن کے دل کی آواز ہے۔ آپ اُن سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

چند سال سے میں دیکھ رہا ہوں کہ جاں نثار غزلوں کی طرف پھر متوجّہ ہوئے ہیں۔ اُن کی حال کی غزلوں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ ہو گیا ہے جو شائع ہونے والا ہے۔ جب جاں نثار فلموں کی دنیا کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ اِس دور کے تازہ ترین میلانات سے اور نئی فکر اور نئی حیثیت سے لازماً دور ہو گئے ہوں گے۔ مگر اس شاعر کا معجزہ یہ ہے کہ ایسی کاروباری دنیا میں بھی اُس کی نگاہیں دل کے داغوں پر رہیں اور دل نئی نسل کے احساس کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ یہ غزلیں "شعور" کی اس حکایت اور اِس کی بلاغت، اشارات اور ادا کا صحیفہ ہیں۔

حالیؔ و اقبالؔ نے غزل کو حدیثِ دلبراں سے صحیفۂ کائنات بنایا۔ غزل کی بساط بہت چھوٹی ہے مگر اس کی لطیف چاندنی میں معنی خیز اشاروں کی ایک کائنات آباد کی جا سکتی ہے۔

حسرت، فانی، اصغر، جگر اور یگانہ سب نے غزل کو اپنے خونِ جگر کی دولت دی اور ادھر دس پندرہ سال سے جو غزل لکھی جا رہی ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گو غزل ساری شاعری نہیں ہے اور نہ ہمیں اسے اردو شاعری کی آبرو کہتے رہنا چاہیے مگر یہ ہر دور کے سوز و ساز کو اپنے نشتروں کے ذریعے سے ظاہر کر سکتی ہے اور ہر سمندر اُس کا تلاطم اِس کے کوزے میں آسکتا ہے۔

جاں نثار کا ایک مطلع دیکھیے۔

انقلابوں کی گھڑی ہے　　　　ہر "نہیں" ہاں سے بڑی ہے

اعتراض کرنے والے اس پر لاکھوں اعتراض کر سکتے ہیں، مگر میرے نزدیک یہ شعر غزل کے اُسی نئے رجحان کو ظاہر کرتا ہے جو ہر چالو کارخانے (Establishment) سے انکار کرتا ہے۔ آج جب ہر طرف لوگ ہاں کہنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، "نہیں" پر یہ اصرار میرے نزدیک ایک مقدس فریضہ ہے اور ایک سچا شعری رویّہ۔ ہاں میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ اگر ہر چیز سے انکار کی لے حد سے بڑھ گئی تو سچے شاعر کو پھر نرمی سے سمجھانا پڑے گا کہ "ہاں" کو نہ بھول جاؤ۔

آج کی حکومتیں، ریڈیو، اخبار اور اس طرح کے اکثر تہذیبی اور تعلیمی ادارے ایک ہی راگ الاپنے پر مُصر ہیں۔ لفظ جو کائنات تھا سمٹ کر نوکر شاہی کا مائیکروفون بن گیا ہے۔ آزاد ذہن کے لیے، حریتِ فکر کے لیے نئے نئے دام ہیں۔ لفظوں کے معنی بدل دیئے گئے ہیں، جمہوریت کے ہم جو معنی سمجھتے تھے اب اس سے بالکل مختلف معنی پر کچھ اربابِ اختیار اصرار کرتے ہیں۔ افکار و اقدار کا ایک طلسم ہوش رُبا بنا دیا گیا ہے جس کی رُوح گم ہو گئی ہے۔ اب جاں نثار کا یہ شعر دیکھیے۔

نزانے کچھ دیئے لفظوں میں خود کو قید کر لیں گے
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں، ہم نہ کہتے تھے

میرا کام جاں نثار کی غزلوں کے منتخب اشعار پیش کرنا نہیں ہے ہر شخص کو اس گلدستے میں سے اپنی پسند کے پھول چُننے چاہییں۔ ہاں میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کی یہ غزل اس مجموعے کے رنگ و آہنگ کی جس طرح عکاسی کرتی ہے اور اس سے غزل کے نئے میلان کی جس طرح نمائندگی ہوتی ہے، اُسے میں غزل کے نئے شباب اور اردو شاعری کے جلوۂ صد رنگ کی ایک بڑی خوب صورت اور تابناک کرن سمجھتا ہوں۔

ہر ایک رُوح میں ایک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دُعا لگے ہے مجھے

پسندِ خاطرِ اہلِ وفا ہے مدت سے
یہ دل کا داغ جو خود بھی بھلا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

میں سو بھی جاؤں تو کیا، میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیئے
ابھی تلک تو وہی فاصلا لگے ہے مجھے

مجھے خوشی ہے کہ جاں نثار کی شاعری آج بھی جوان ہے اور آج کی حسّیت کی اپنے طور پر عکّاسی کر رہی ہے۔ سچّا اور اچھا شاعر اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتا ہے اور ہم اس سے زیادہ اور کس چیز کی توقّع کر سکتے ہیں۔

آل احمد سرور



جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا لب ولہجہ پچھلے چند سال کا سب سے اہم اور خوش گوار ادبی حادثہ ہے۔ جاں نثار اختر اُن قدما میں سے ہیں جو قدیم ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ جن کی خاموشیاں بھی تھکن کے بجائے فکر کی بلاغت سے معمور رہیں، عین اُس وقت جب اُردو شاعری کے مورخ انھیں فیض، مجاز، مخدوم اور جذبی کے صف میں سجا بنا کر طاقِ نسیاں کی زینت کرنے کی تیاری میں مصروف تھے، نقاد اپنی درجہ بندیوں سے مطمئن اور جاں نثار نواز اُن کی خاموشیوں پر قانع ہو چکے تھے، بڑے غیر متوقع انداز میں جاں نثار نے پھر نغمہ سرائی شروع کر دی اور تعجب یہ ہے کہ یہ نغمہ سرائی ماضی کا تسلسل یا پرانی دھنوں کی تکرار نہ تھی، ایسے نرالے اور شگفتہ نغموں سے عبارت تھی کہ بس ــــــ! جیسے اپنے نغموں کے مقدس آتش خانوں کی آگ روشن کر کے جل جانے والے مرغِ آتش نوا نے دوسرا جنم لے لیا ہو، ایسا نیا جنم کہ پُرانے جاننے والوں کے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل ٹھہرا کہ کلام کے یہ دونوں رنگ ایک ہی شاعر کی تراوشِ فکر ہیں۔

بات یہ ہے کہ جاں نثار اختر ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو زندگی کے بارے میں شاعری نہیں کرتے، شاعری کو زندگی بنا کر گزارتے ہیں۔ وہی اجنبیت، وہی نرمی، وہی معصومانہ حیرت جیسے وہ سر پر وقت کی تیز دھوپ برساتے ہوئے سورج کے نیچے سے نہ گزر رہے ہوں بلکہ کسی دیوان کے اوراق میں زندہ ہوں، اسی لیے اُن کی زندگی کی نامرادیاں اور کامرانیاں ہیں ایسی کہ جنھیں ایک زاوئے سے دیکھیئے تو اُن پر بڑا پیار آتا ہے اور دوسرے زادیے سے دیکھیئے تو غصہ۔ وہ نہ اپنی ذہانت کو نیلام کرنے پر راضی ہوئے، نہ علم کو بوجھ

بنانے پر آمادہ ہو سکے اور احساس کے ایک چبھتے رہنے والے نشتر کو زندگی بھر گلے لگائے رہنے کے سبب وہ سوائے اپنے اس بے نام درد کے دنیا کی کسی اور متاع کو خاطر میں نہ لائے۔

جاں نثار کے نئے لب و لہجے کا راز یہی بے پایاں گداز ہے جس میں نرمی اور بانکپن تو ہے مایوسی اور محرومی کا ماتم بہت کم ہے۔ جاں نثار زندگی کو عمر کی اُس منزل سے دیکھ رہے ہیں جب اُسے ایک مکمّل اکائی کی حیثیت سے اور بھرپور انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سہ پہر کی دھوپ کی طرح اس میں اُداسی بھی ہے اور حسن بھی۔ جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو ایک بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے، سکہ بند ردِ عمل (Stock Responses) سے دور ہٹ کر دیکھا ہے اور اس مشاہدے بلکہ تجربے کو بے اختیارانہ بیان کرنے کے لیے ایک نیا شگفتہ اور جاندار پیرایۂ بیان ایجاد کیا ہے۔ یہ "ایجاد" انھیں معنوں میں ہے، جن معنوں میں میرؔ نے اپنے شیوۂ گفتار کو اور غالبؔ نے اپنی مکتوب نگاری کے اسلوب کو خاص اپنی ایجاد بتایا تھا۔

غزل میں اس قسم کی "ایجاد" عجائبات میں سے ہے کہ یہ صنف صدیوں سے سرد و گرم جھیلتی اپنے مزاج کے مطابق راستے بدلتی، اور تجربات کو بے روح کرتی چلی آئی ہے۔ جاں نثار اختر کی ندرت کا راز کیا ہے؟ اِسے پہچان لینا آسان ہے بیان کرنا دشوار ہے۔ بے شبہہ اس غزل میں نئے دور کی کھنک ہے۔ اس دور نے اس حقیقت کو بڑے درد اور کرب کے ساتھ سیکھا ہے کہ دنیا کا سنورنا آسان نہیں اور مختلف سادہ سے حل مان لینے سے کام نہیں چلتا، اس افراتفری اور بے اماں زندگی میں اگر کچھ کام کا ہے تو صرف احساس کا کھرا پن[1]، اپنے آپ پر بھروسہ کرنے اور اپنی چال چلنے کی لگن[2] اور بڑی مشکل سے ہاتھ آنے والی بے خبری[3]۔ شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص احساس کے سکّہ بند راستوں سے بچ نکلنا بڑی جوکھم کا سودا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب جنوں اور رجائیت کی حکمرانی تھی، ہر موضوع پر نہیں ہر رویّے پر بھی مہریں لگی تھیں۔ اب ایسا زمانہ آیا کہ لوگ ذات اور محرومی کے فلسفیانہ خول میں ایسے ڈوبے کہ سکّہ بند رویّے تک جا پہنچے ہیں۔ جاں نثار اختر کی غزل کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی ہنرمندی سے دونوں سکّہ بند رویّوں سے دامن

---

[1] پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا، اور اب — ایک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں

[2] سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو — بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

[3] آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں — بڑی مشکل سے میاں، بے خبری آوے ہے

بچا گئے اور اپنی شخصیت کے کندن کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اُنھیں اس کا اعتراف ہے کہ پرانے حل اور کل کے عقیدے آج انسانوں کے پاؤں تلے سے کھسک رہے ہیں:

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

---

ہم نے انسانوں کے دُکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

---

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرا دکھائی دیتا ہے

لیکن جاں نثار اختر اس صورت حال پر قانع اور مطمئن نہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک مقدس کرب ہے جو خوابوں کو خواب سمجھنے پر بھی انہی خوابوں کو پلکوں پر سجانے کے لیے بے چین ہے کیونکہ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے وہ اِن خوابوں کو نشہ آور دوا کے طور پر استعمال نہیں کرتے لیکن وہ مانتے ہیں کہ انسان کی زندگی ساری رنگینی اور جنوں کی ساری سرمستی تو انہی خوابوں کے دم سے ہے، جب تک ان خوابوں کی حیات آفرینی شامل نہ ہو حیات ادھوری اور ناتمام ہے:

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو، پلکوں کے خواب جتنے ہیں

---

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

---

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چُبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

---

اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بساؤ یارو    ایک بھی خواب نہ ہو جس میں وہ آنکھیں کیا ہیں

بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی چیخ سہی
ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

---

دُنیا کی کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں جو خوابِ سحر ہم

ایسے ہی جانے کتنے اشعار ہیں جن میں زندگی کا حوصلہ، بے اماں حوصلہ موجزن ہے۔ دراصل زندگی کی مسکراہٹوں کو چُن کر خوش ہو لینا اور صبحِ فردا کی اُمید سے آسودہ ہو لینا آسان ہے اور تیرہ بختی اور نامرادی پر خون کے آنسو رو کر مایوس ہو جانا بھی ــــ ان دونوں کے آمیزے کو زہر اور امرت کا مرکّب سمجھ کر قبول کر لینا بہت مشکل ہے۔ حیاتی سطح کا تجربہ جان لیوا ہے کہ زندگی کا کوئی سُکھ، دُکھ کے کانٹے سے خالی نہیں اور کوئی دُکھ نشاط کی لطیف سی رنگینی سے معریٰ نہیں۔ اس کا عرفان آسان ہے اِس کو بھوگنا بھگتنا بہت دشوار ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا لب و لہجہ اسی عرفان اور اسی بھگتان کا پیدا کردہ ہے۔

جاں نثار اختر کی کامرانی نئے موضوعات کی تلاش میں مضمر نہیں۔ نئے رویئے اور سچّے اور کھرے احساس اور پیرایۂ بیان میں مضمر ہے۔ جاں نثار نے اردو غزل کو نیا پیرایۂ بیان عطا کیا ہے جو پُرانے رنگ ڈھنگ سے بالکل جُداگانہ ہے۔ اس پیرایۂ بیان کی تین چار جہتیں ہیں جن کی مثالیں یہاں دی جاتی ہیں۔

۱۔ پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

---

۲۔ برکھا کی تو بات ہی چھوڑو، چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر

---

۳۔ ہم نے انسانوں کے دُکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

---

۴ - اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

پہلے شعر کے انداز کے کئی اور اشعار اس مجموعے میں ملیں گے جن میں صرف تشبیہ و استعارے ہی عام روزمرہ کی ماڈرن زندگی سے نہیں لیے گئے ہیں بلکہ تجربات بھی اسی قسم کے ہیں جن پر شہروں کی نئی زندگی کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ غزل کو نئی امیجری دینے کی متعدد کوششیں بے کار ہو چکی ہیں لیکن اس امیجری میں آورد نہیں آمد ہے، تجربے کی چاندنی اور احساس کا کندن ہے۔ اسی وجہ سے ماڈرن زندگی کی یہ تصویریں غزل میں نئی بھی لگتی ہیں اور بھلی بھی۔ یہاں ندرت، احساس اور جدّتِ ادا لغزگوئی بن گئی ہے۔

دوسرے شعر میں بات کو سیدھے سادھے تشبیہ و استعارے کے پیرائے میں ادا کرنے کے بجائے کسی قدر بالواسطہ انداز میں کہا گیا ہے۔ یہی نہیں کہ شعر کے جلو میں کھلے ہوئے آسمان اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی ہریالی آ گئی ہے، عشق اور حسن کا ایک نیا تصور بھی جاں نثار اختر کے اسی اسلوب میں سمٹ آیا ہے۔ وہی نیا تصورِ عشق ہے جسے وہ گھر آنگن کی رباعیوں میں جاوداں کر چکے ہیں یعنی ماڈرن زندگی کے پس منظر کا "کھٹ مٹھا" عشق جسے غمِ دوراں کی کش مکش نے اور بھی نکھار بنا دیا ہے۔ عشق و عاشقی کے ان مناظر میں دل موہ لینے والی بے ساختگی اور معصومیت ہے جس کا اندازہ کچھ مندرجۂ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رُک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آ جائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

حسن کی ایسی موہنی جھلکیاں خاص طور پر تین چار غزلوں میں بہت ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ جاں نثار اختر یہاں اپنے لب و لہجے کی تازگی نئی عشقیہ فضا سے پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے حسن کے بھولے پن اور عشق کی وارفتگی کو ماڈرن زندگی کے پس منظر میں رکھ کر اجاگر کیا ہے۔

تیسرے شعر کا اسلوب تشبیہ و استعارے سے آزاد ہے اور براہِ راست بھی۔ دوسرے مصرعے میں جو زبردست طنز ہے وہ اس کی چوٹ کو اور گہرا اور اس کے پیرایۂ بیان کو اور دل نشیں

بنتا ہے۔ پہلا مصرعہ قاری کو جس قسم کے ردِّ عمل کے لیے تیار کرتا ہے دوسرا مصرعہ اس کے بالکل برعکس تاثر پیدا کرتا ہے اور اس تضاد اور تخالف سے شاعر براہِ راست بات میں لطیف رمز کا پہلو نکال لیتا ہے۔ یہ ادا بندی کا نیا انداز ہے جسے میری دانست میں جاں نثار اختر نے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

چوتھے شعر کا پیرایۂ بیان اس پیچ سے بھی خالی ہے۔ بالکل سیدھا سادا، براہِ راست مگر اس براہِ راست انداز میں جو خوبی پیدا ہوتی ہے اس شعر کے پیچھے تڑپنے والے تجربے سے ہوئی ہے۔ خوابوں کو عزیز رکھنے والے شاعر کے لیے یہ عرفان کہ زندگی بھر جسے متاعِ بے بہا جانا وہی دراصل زندگی کی ناکامی کا سبب ہے، جس کھرے پن پر ساری مسرتیں واردیں وہی کھوٹا نکلا۔ اس عظیم المیے نے شعر میں جو خونِ جگر کا رنگ بھرا ہے اُس نے اسے ہر آرائش اور زیبائش سے بے نیاز کر دیا ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری صرف نئے زاویوں سے عبارت ہے نہ محض نئے پیرایۂ بیان سے۔ اس کے پیچھے ایک نئی فضا جگمگاتی ہے، یہاں دہلیز کی متلاشی لاشیں بھی ہیں، زندگی کی کڑی دھوپ میں تیز قدموں سے چلنے والے راہی بھی، ہاتھوں پر چھالوں کی طرح چمکتے ہوئے سکے بھی، رات گئے دل کی اُبھرتی ہوئی چوٹیں بھی ہیں، اخبار کے دفتر کی خبریں بھی، شانے پر ہاتھ رکھ کر ساڑیوں کی دکانوں پر رو کنے والی محبوبائیں بھی، غرض ایک عجیب و غریب دنیا ہے جس میں آوازیں، چیخیں، سرگوشیاں، اور ارمانوں کے نہ جانے کتنے روپ نگر آباد ہیں۔ یہ دنیا غزل کے دوسرے مشاہیر کی دنیا سے الگ تھلگ اور انوکھی ہے۔ اور اس دُنیا کی تعبیر سے اُردو غزل کو نئی امیجری نئی لفظیات بھی ارزانی ہوئی ہیں۔ نئی بحریں بھی ملی ہیں، نئی تشبیہیں اور استعارے بھی۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد بھی جاں نثار اختر کی شاعری اور اُس کے نئے لب و لہجہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ شاعری کا اگر کوئی اس طرح احاطہ کر پاتا تو شاعری اس قدر مشکل فن نہ ٹھہرتی۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ جاں نثار اختر اپنے نئے زاویوں، نئے پیرایۂ اظہار، نئی امیجری، نئی تہذیبی فضا، نئی پیکر تراشی سے پڑھنے والے میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کر پائے ہیں یا نہیں جو اُس کے نزدیک زندگی کی معنویت میں ردّ و بدل کر سکے۔ کیا ان غزلوں کو پڑھنے، اور ان سے لطف لینے کے بعد عام قاری زندگی کو نئی نظر سے دیکھنے کے قابل ہوگا، کیا اُس کی بصیرت اور اندازِ احساس میں کوئی نیا عنصر داخل ہوگا، کیا وہ پرانی چیزوں کا نیا رُخ دیکھ پائے گا، کیا وہ آہستہ

آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے کو بدلتا ہوا محسوس کرے گا، ایسی تبدیلی جس میں آتشِ رفتہ کا سراغ بھی ہو اور آنے والی صبح کا نور بھی۔ لیکن ان سوالوں کا جواب کاغذوں اور کتابوں پر نہیں دلوں کے نہاں خانوں اور تنہائی میں گنگنائے جانے والے اشعار میں دیا جاتا ہے کہ یہی ہر کامیاب شعری مجموعے کا پیش لفظ بھی ہوتے ہیں اور اختتامیہ بھی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ جگمگاتی جاگتی نئی آواز جلد ہی اُردو والوں کے اجتماعی لاشعور کا حصّہ بن جائے گی، یہ اشعار زبانوں پر رواں ہوں گے، دلوں میں اُتریں گے، خوابوں میں بسیں گے، سینوں میں جلیں گے اور تنہائیوں کو گرمائیں گے اور مہکائیں گے۔

محمد حسن



جاں نثار اختر سے میرے ۳۲ برس کے مراسم ہیں۔ میں نے ان کو گوالیار میں دیکھا ہے جب وہ وکٹوریہ کالج میں اردو کے لکچرار تھے اور "گرلز کالج کی لاری" "بگولے" اور "کون ساگیت سنو گی انجم" کی وجہ سے مشہور تھے۔ میں نے ان کو بمبئی میں بھی دیکھا ہے جب امن نامہ، خاک دل، خاموش آواز اور آخری ملاقات کی بدولت ان کی شہرت بوئے گل کی طرح عام ہو چکی تھی۔ اور کوئی پڑھا لکھا گھرانا ایسا نہیں تھا جہاں اُن کی اِن خوب صورت نظموں یا صفیہ کے خوں چکاں خطوں کا بار بار ذکر نہ ہوتا ہو۔ میں نے اُن کو "گھر آنگن" کے اُس شاعر کے روپ میں بھی دیکھا جس کی بدولت انھوں نے اردو شاعری کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور اس میں ہندی کی سپردگی، نرمی اور شیرینی بھر دی اور آخر میں اُن کو غزل گو کی حیثیت سے دیکھا جہاں انھوں نے غزل ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں بخشا بلکہ اپنی شہرت کو بھی نئی عظمتوں سے روشناس کیا۔ اِس ربع صدی میں بہت سے شاعر ابھرے اور ختم ہو گئے۔ بہت سے شاعر کچھ دیر کے لیے چمکے اور غائب ہو گئے لیکن جاں نثار اختر کی شاعری کا گراف برابر مائل بہ ترقی رہا۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو ارثاً جو شاعری ملی ہے وہ نک سک سے درست ہے (وہ حضرت مضطر خیرآبادی کے بیٹے ہیں) بعد میں علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے اُس پر اور جلا ہو گئی۔ قدیم کی احتیاط اور جدید کی پذیرائی جیسی اُن کے یہاں ہے وہ کم لوگوں کے حصّے میں آئی ہے۔ ماحول بھی ان کو گوالیار اور بھوپال کا ملا جہاں کی تہذیب اور شائستگی ہندوستان کی دولت

ہے اور آخر میں بمبئی میں رہے جو شاہد و شعر و شباب اور مے و رامش و رنگ ہی کا گہوارہ نہیں، نئے صنعتی تمدّن کا مرکز اور نئے خیالات کا سرچشمہ بھی ہے۔ اِس لیے اگر اخترؔ کے کلام میں ہمیں قدیم شاعری کی صحت اور مہارتِ شعری، جدید کی حیثیت اور پیکر تراشی ملتی ہے تو حیرت کی بات نہیں۔

جاں نثار اخترؔ نے غزل کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب اُس کی "گردن مارے جانے کا" اعلان ہو چکا تھا اور وہ بورژوا زندگی کے ابتذال، انتشار اور پراگندہ مزاجی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی۔

اخترؔ نے نئی غزل کے ذریعے نہ صرف اس کا رشتہ ادبی تاریخ سے پھر جوڑا بلکہ اس کو ایک نئی سمت جہت، نئی معنویت، نئی حیثیت، نئی لفظیات اور نئی دل کشی عطا کی۔ اس اعتبار سے غزل کی عصری تاریخ میں اُن کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ ان کی غزلیں صاف عصرِ حاضر کی چیز معلوم ہوتی ہیں اور ان کی شخصیت اِس مینائے غزل سے چھلکی جاتی ہے۔ اُن کی آواز میں بہت سی پچھلی آوازیں شامل ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ کے اُن کے خاندانی ورثے اور گرد و پیش کے ماحول سے مل جاتی ہے تو یہ سحر کار آواز قیامت بن جاتی ہے۔

جاں نثار اخترؔ نے بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں، بڑی کڑیاں جھیلی ہیں، زمانے کے گرم و سرد کو چکھا ہے لیکن میں نے اُن کو کبھی روتے اور بسورتے ہوئے نہیں دیکھا، ہر حال میں اخترؔ صاحب ہی پایا۔ وہی پاسِ وضع، وہی نگاہِ شرم، وہی خوش طبعی، وہی عاشق مزاجی۔ انھوں نے دار و رسن کی منزلوں کو مسکراتے ہوئے طے کیا اور خوشی کے عارضی لمحوں سے پوری خوشی حاصل کی، نہ ان کو جادواں بنایا اور نہ ان کو حقیر سمجھا۔ وہ حُسن کی اداؤں کو پہچانتے ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ ارمان بھی ہے کہ محبوب کی زُلفیں اُن ہی کے بازوؤں پر پریشان ہوں اور وہ سچّے عاشق کی طرح ان ہی پر ساری مہربانیاں صرف کر دے اتنی کہ ـــــ زغارت چمنت بر بہار منت ہا است۔ لیکن یہ کہنا کفرانِ نعمت ہو گا کہ اخترؔ کی زندگی سراسر محرومی یا مایوسی کی زندگی رہی ہے، انھوں نے دل دیا بھی ہے اور لیا بھی ہے۔ وہ عمر بھر شرابی سے رہے ہیں۔ سرشار و سرمست۔ اِس سرخوشی کا سرچشمہ، دل کی گلابی ہی نہیں، فن کی سرشاری بھی ہے۔

اخترؔ کی غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی عموماً پانچ چھے یا سات شعر

ہوتے ہیں لیکن سب منتخب ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلابی جاڑے ہیں، رات ہوگئی ہے اور ایک ایک کرکے چراغ روشن کردیے ہیں یا عماریٔ شب میں قمر کا جلوس ہے جو نکل رہا ہے ۔ اِس اُجالے سے ہمارے گردوپیش ہی میں نہیں، دل میں بھی اُجالا ہوجاتا ہے ۔ اِس آرٹ کے ذریعے جس میں لفظ و معنی کی دوئی مٹ گئی ہے، ہم دنیا کی ظلمتوں کو بھول جاتے ہیں اور اسی آرٹ کے ذریعے ہمارا رشتہ دُنیا سے پھر استوار ہوتا ہے ۔ ؎

نہ لفظ ہے نہ کنایہ، نہ صوت ہے، نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھے کوئی زبان ہم سے

جاں نثار اختر کو یقین اور کیٹس (Keats) کی طرح ادبی مصوّری میں بڑا ملکہ ہے، وہ ایسی ایمائی قوت کے حامل ہیں جو ایک مصوّر کی طرح کشش کے ہلکے ہلکے خطوط سے جہانِ معنی پیدا کرسکتی ہے، وہ ذہنی اور تجریدی تصوّرات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کرسکتے ہیں محسوسات اور کیفیات کی تتلیوں کو گرفت میں لانا آسان نہیں ۔ ہاتھ آویں تو ہاتھ لگائے نہ بنے ۔ لیکن جاں نثار اختر نے بدن کی خوشبو، بہتی ہوئی ندیا اور سوتی ہوئی کرن کو محسوس اور جان دار استعاروں کے قالب میں ڈھال دیا ہے ۔ اور اسی لیے وہ شعر، پیکر تصویر بن گئے ہیں ۔ اِن میں الفاظ کا رقص ہے، حیات کا نغمہ ہے، اور کلا کی سنگتی ہے ۔ اختر کی غزلیں فطرت اور زندگی کی نکہتوں سے معمور ہیں ۔ ان میں لطیف رومانیت ہے ۔ جنسیاتی تحلیل ہے، شاعرانہ مصوّری ہے لیکن کوئی بے کراں جذبہ، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے ۔ ان کی شفاعت میں فرانس کی ایلوئی (Heloise) کے وہ لافانی الفاظ پیش کیے جا سکتے ہیں جو اس نے اپنے حبیب ابی لار (Abelard) کو خونِ دل سے لکھے تھے ۔

"میں ایسا خط نہیں چاہتی جس سے تمھاری علمیّت یا فضیلت ظاہر ہو
میں تو اُن بولوں کے سننے کی مشتاق ہوں جو بے ساختہ تمھارے
دل سے نکلے ہوں"

یہی شاعرانہ خلوص، یہی حسّی تجربہ اِن غزلوں کی اصلی قدر و قیمت ہے ۔

خواجہ احمد فاروقی



فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عُمر پڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

ہم نے صدیوں انھیں ذرّوں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے، منالیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دُور کھڑی ہے یارو

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے
صرف کہنے کے لیے بات بڑی ہے یارو

اُن کے بن جی کے دکھادیں گے اُنھیں، یوں ہی سہی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو



جب لگیں زخم تو قاتل کو دُعا دی جائے
ہے یہی رسم تو، یہ رسم اُٹھا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دُکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

ابھی گلرنگ دریچوں سے سحر جھانکے گی
کیوں نہ کھلتے ہوئے زخموں کو دُعا دی جائے

کم نہیں نشّے میں جاڑے کی گلابی راتیں
اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے



زندگی یہ تو نہیں، تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اُتارا ہی نہ ہو

کوئے قاتل کی بڑی دھوم ہے چل کر دیکھیں
کیا خبر، کوچۂ دلدار سے پیارا ہی نہ ہو

دل کو چھُو جاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اُٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

کبھی پلکوں پہ چمکتی ہے جو اشکوں کی لکیر
سوچتا ہوں ترے آنچل کا کنارا ہی نہ ہو

زندگی ایک خلش دے کے نہ رہ جا مجھ کو
درد وہ دے جو کسی طرح گوارا ہی نہ ہو

شرم آتی ہے کہ اُس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ[1] ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

---

[1] نہ کو میں نے عمداً "نا" کے وزن پر استعمال کیا ہے۔

(جاں نثار اختر)



ہر ایک رُوح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دُعا لگے ہے مجھے

پسندِ خاطرِ اہلِ وَفا ہے مُدّت سے
یہ دل کا داغ جو خود بھی بھلا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

میں سو بھی جاؤں تو کیا، میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

میں سوچتا تھا کہ لوٹوں گا اجنبی کی طرح
یہ میرا گاؤں تو پہچانتا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیے
ابھی تلک تو وہی فاصلا لگے ہے مجھے

حکایتِ غمِ دل کچھ کشش تو رکھتی ہے
زمانہ غور سے سُنتا ہوا لگے ہے مجھے



اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

پھر بھی چھونا اُسے، آسان نہیں
اتنی دوری پہ بھی، جو پاس لگے

وقت سایا سا کوئی چھوڑ گیا
یہ جو اک درد کا احساس لگے

ایک اک لہر کسی یگ کی کتھا
مجھ کو گنگا کوئی اتہاس لگے

شعر و نغمے سے یہ وحشت تیری
خود تری رُوح کا افلاس لگے



رہی ہیں دادطلب اُن کی شوخیاں ہم سے
اداشناس بہت ہیں، مگر کہاں ہم سے
سُنادیئے تھے کبھی کچھ غلط سلط قصّے
وہ آج تک ہیں اُسی طرح بدگماں ہم سے
یہ کُنج کیوں نہ زیارت گہِ محبت ہو
ملے تھے وہ اِنھیں پیڑوں کے درمیاں ہم سے
ہمیں کو فرصت نظّارگی نہیں، ورنہ
اشارے آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے
ہر ایک رات نشے میں ترے بدن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کے صراحیاں ہم سے
نہ لفظ ہے، نہ کنایہ، نہ صوت ہے، نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھے کوئی زباں ہم سے
ہماری قدر کرد اے سخن کے متوالو
غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے



ذراسی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا
دلِ تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا

گزر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح
ابھی تو میں اُسے پہچان بھی نہ پایا تھا

معاف کر نہ سکی میری زندگی مجھ کو
وہ ایک لمحہ کہ میں تجھ سے تنگ آیا تھا

شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اِس کمال سے تو نے بدن چُرایا تھا

پتا نہیں کہ مرے بعد اُن پہ کیا گزری
میں چند خواب زمانے میں چھوڑ آیا تھا

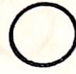


صبح کے درد کو، راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اُس وعدہ شکن کو بھولیں

آج تک چوٹ دبائے نہیں دبتی دل کی
کس طرح اُس صنمِ سنگ بدن کو بھولیں

اب سوا اِس کے مداوائے غمِ دل کیا ہے
اتنی پی جائیں کہ ہر رنج و محن کو بھولیں

اور تہذیبِ غمِ عشق نبھا دیں کچھ دن
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں



اک جاں گداز نشّہ رگ و پے میں بس گیا
سارے بدن سے رات کوئی مجھ کو ڈس گیا

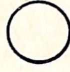
آنکھیں اُٹھیں تو درد کے چشمے اُبل پڑے
پلکیں جھکیں تو پیار کا بادل برس گیا

دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے
باہوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

آنسو گرا ہے جو مری پلکوں سے ٹوٹ کے
ایسا لگا کہ جیسے کوئی مجھ پہ ہنس گیا

حیراں ہیں کائنات کی بے تھاہ وسعتیں
انساں کا ذہن چند کتابوں میں دھنس گیا

ہر مصلحت سے فن کو چھڑاتے چلے ہیں ہم
وہ ہچکچاہٹیں گئیں، وہ پیش و پس گیا



موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے

ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر، راہ گزر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

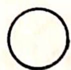
جل گیا اپنا نشیمن تو کوئی بات نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ اب آگ کدھر لگتی ہے

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

لکھنؤ! کیا تری گلیوں کا مقدّر تھا یہی
ہر گلی آج تری خاک بسر لگتی ہے



ہم سے بھاگا نہ کرو دور، غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمھیں، چاہنے والوں کی طرح

خود بخود نیند سی آنکھوں میں گھلی جاتی ہے
مہکی مہکی ہے شبِ غم ترے بالوں کی طرح

تیرے بن، رات کے ہاتھوں پہ یہ تاروں کے ایاغ
خوب صورت ہیں مگر زہر کے پیالوں کی طرح

اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں
دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح

گنگناتے ہوئے در آ کبھی اُن سینوں میں
تیری خاطر جو مہکتے ہیں شوالوں کی طرح

تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

ہم سے مایوس نہ ہو، اے شبِ دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اُجالوں کی طرح

مجھ سے نظریں تو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے
میری آنکھوں میں سُلگتے ہیں سوالوں کی طرح

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صِلا
چند سکّے ہیں میرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

جستجو نے کسی منزل پہ ٹھہرنے نہ دیا
ہم بھٹکتے رہے آوارہ خیالوں کی طرح

زندگی جس کو ترا پیار ملا وہ جانے
ہم تو ناکام رہے، چاہنے والوں کی طرح



آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی اُن دالانوں پر
اُس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ ے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رُک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو، چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹا پھینک گئی ہے دھانوں پر

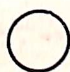
شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کُھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

اُس کا کیا من بھید بتاؤں، اُس کا کیا انداز کہوں
بات بھی میری سُننا چاہے، ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

اور بھی سینہ کسنے لگتا، اور کمر بل کھا جاتی
جب بھی اُس کے پاؤں پھسلنے لگتے تھے ڈھلوانوں پر

شعر تو اُن پر لکھّے لیکن اوروں سے منسوب کیے
اُن کو کیا کیا غصّہ آیا، نظموں کے عنوانوں پر
یارو اپنے عشق کے قصّے یوں بھی کم مشہور نہیں
کل تو شاید ناول لکھّے جائیں، ان رومانوں پر



اشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سُنانے کے لیے ہیں

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لیے ہیں

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چُبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہیں

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بُجھانے کے لیے ہیں

یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بُھلانے کے لیے ہیں



صبح کی آس کسی لمحے جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

شام ڈھلتے ہی ترا درد چمک اُٹھتا ہے
تیرگی دور تلک رات کی، چھٹ جاتی ہے

اپنے تابندہ خیالوں کو چھپا کر مت رکھ
روشنی کم نہیں ہوتی ہے جو بٹ جاتی ہے

برف سینوں کی نہ پگھلے تو یہی رودِ حیات
جوئے کم آب کی مانند سمٹ جاتی ہے

آہٹیں کونسی خوابوں میں بسی ہیں جانے
آج بھی رات گئے نیند اُچٹ جاتی ہے

ہاں خبردار! کہ اک لغزشِ پا سے بھی کبھی
ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے



آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں

کیا یونہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

اے دہر! ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سَو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

ایسے میں زلفِ یار نہ ہم سے گریز کر
ہم آج تیرے پاس پریشاں سے آئے ہیں

وہ میرؔ کی غزل ہو کہ غالبؔ کی شاعری
نغمے تمام سازِ رگِ جاں سے آئے ہیں



اے دردِ عشق تجھ سے مکرنے لگا ہوں میں
مجھ کو سنبھال، حد سے گزرنے لگا ہوں میں

پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا، اور اب
ایک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

اے چشمِ یار! میرا سُدھرنا محال تھا
تیرا کمال ہے کہ سُدھرنے لگا ہوں میں

یہ مہر و ماہ، ارض و سما مجھ میں کھو گئے
اک کائنات بن کے اُبھرنے لگا ہوں میں

اتنوں کا پیار مجھ سے سنبھالا نہ جائے گا!
لوگو! تمھارے پیار سے ڈرنے لگا ہوں میں

دلّی! کہاں گئیں ترے کوچوں کی رونقیں
گلیوں سے سر جھکا کے گزرنے لگا ہوں میں



ہم نے کاٹی ہیں تری یاد میں راتیں اکثر
دل سے گزری ہیں ستاروں کی براتیں اکثر

اور تو کون ہے جو مجھ کو تسلّی دیتا
ہاتھ رکھ دیتی ہیں دل پر تری باتیں اکثر

حُسن شائستۂ تہذیبِ الم ہے شاید
غمزدہ لگتی ہیں کیوں چاندنی راتیں اکثر

حال کہنا ہے کسی سے تو مخاطب ہے کوئی
کتنی دلچسپ ہوا کرتی ہیں باتیں اکثر

عشق رہزن نہ سہی، عشق کے ہاتھوں پھر بھی
ہم نے لُٹتی ہوئی دیکھی ہیں براتیں اکثر

ہم سے اکبار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر

اُن سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کتابوں کی کیا کرتے ہیں باتیں اکثر

ہم نے اُن تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے اُلٹ دی ہیں بساطیں اکثر



سنو! چاند بھی چمکیں گے تو کیا بات بنے گی
تم آئے تو اس رات کی اوقات بنے گی

اُن سے یہی کہہ آئیں کہ اب ہم نہ ملیں گے
آخر کوئی تقریبِ ملاقات بنے گی

اے ناوکِ غم دل میں ہے اک بوند لہو کی
کچھ اور تو کیا ہم سے مدارات بنے گی

یہ ہم سے نہ ہوگا کہ کسی ایک کو چاہیں
اے عشق! ہماری نہ ترے سات بنے گی

حیرت کدۂ حسن کہاں ہے ابھی دُنیا
کچھ اور نکھر لے تو، طلسمات بنے گی

یہ کیا ہے کہ بڑھتے چلو بڑھتے چلو آگے
جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی



لوگ کہتے ہیں کہ تو اب بھی خفا ہے مجھ سے
تیری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

ہائے اس وقت کو کوسوں کہ دُعا دوں یارو
جس نے ہر درد مرا چھین لیا ہے مجھ سے

دل کا یہ حال کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی جرم ہوا ہے مجھ سے

کھو گیا آج کہاں رزق کا دینے والا
کوئی روٹی جو کھڑا مانگ رہا ہے مجھ سے

اب مرے قتل کی تدبیر تو کرنی ہو گی
کون سا راز ہے تیرا جو چھپا ہے مجھ سے



زلفیں، سینہ، ناف، کمر
ایک ندی میں کتنے بھنور

صدیوں صدیوں میرا سفر
منزل منزل راہ گذر

کتنا مشکل، کتنا کٹھن
جینے سے جینے کا ہنر

گاؤں میں آ کر شہر بسے
گاؤں بچارے جائیں کدھر

پھونکنے والے سوچا بھی
پھیلے گی یہ آگ کدھر

لاکھ طرح سے نام ترا
بیٹھا لکھوں کاغذ پر

چھوٹے چھوٹے ذہن کے لوگ
ہم سے اُن کی بات نہ کر

پیٹ پہ پتھّر باندھ نہ لے
ہاتھ میں سجتے ہیں پتھّر
رات کے پیچھے رات چلے
خواب ہوا ہر خوابِ سحر
شب بھر تو آوارہ پھرے
لوٹ چلیں اب اپنے گھر



ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کا جل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں

آج ذرا للچائی نظر سے اُس کو بس کیا دیکھ لیا
پگ پگ اُس کے دل کی دھڑکن اُتری آئے پایل میں

پیاسے پیاسے نیناں اُس کے جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے، سوچے، ندیا بھرلوں چھاگل میں

صبح نہانے جوڑا کھولے، ناگ بدن سے آ لپٹیں
اُس کی رنگت، اُس کی خوشبو کتنی ملتی صندل میں

چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل ٹک جائے
ایسے اُس کا گرتا آنچل اٹکے آڑی ہیکل میں

گوری اس سنسار میں مجھ کو ایسا تیرا روپ لگے
جیسے کوئی دیپ جلا ہو گھور اندھیرے جنگل میں

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں
آج پتا کیا، کون سے لمحے کون سا طوفاں جاگ اُٹھے
جانے کتنی درد کی صدیاں گونج رہی ہیں پل پل میں
ہم بھی کیا ہیں کل تک ہم کو فکر سکوں کی رہتی تھی
آج سکوں سے گھبراتے ہیں، چین ملے ہے ہل چل میں



خود بخود مے ہے کہ شیشے میں بھری آوے ہے
کس بلا کی تمھیں جادو نظری آوے ہے

دل میں در آوے ہے ہر صبح کوئی یاد ایسے
جوں دبے پاؤں نسیمِ سحری آوے ہے

اور بھی زخم ہوئے جاتے ہیں گہرے دل کے
ہم تو سمجھے تھے تمھیں چارہ گری آوے ہے

ایک قطرہ بھی لہو جب نہ رہے سینے میں
تب کہیں عشق میں کچھ بے جگری آوے ہے

چاکِ داماں و گریباں کے بھی آداب ہیں کچھ
ہر دوانے کو کہاں جامہ دری آوے ہے

شجرِ عشق تو مانگے ہے لہو کے آنسو
تب کہیں جا کے کوئی شاخ ہری آوے ہے

تو کبھی راگ، کبھی رنگ، کبھی خوشبو ہے
کیسی کیسی نہ تجھے عشوہ گری آوے ہے

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں، بے خبری آوے ہے

اے مرے شہرِ نگاراں[1] ترا کیا حال ہوا
چپّے چپّے پہ مری آنکھ بھری آوے ہے

صاحبو! حسن کی پہچان کوئی کھیل نہیں
دل لہو ہو تو کہیں دیدہ وری آوے ہے

---

[1] لکھنؤ



حوصلہ کھو نہ دیا تیری نہیں سے ہم نے
کتنی شکنوں کو چُنا تیری جبیں سے ہم نے

وہ بھی کیا دن تھے کہ دیوانہ بنے پھرتے تھے
سُن لیا تھا ترے بارے میں کہیں سے ہم نے

جس جگہ پہلے پہل نام ترا آتا ہے
داستاں اپنی سنائی ہے وہیں سے ہم نے

یوں تو احسان حسینوں کے اُٹھائے ہیں بہت
پیار لیکن جو کیا ہے تو تمھیں سے ہم نے

کچھ سمجھ کر ہی خدا تجھ کو کہا ہے ورنہ
کون سی بات کہی اتنے یقیں سے ہم نے

کب سے آدم کی طرح توڑ رکھا ہے ناتا
اے علی گڑھ ترے فردوس حسیں سے ہم نے



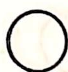
بے صرفہ زندگی کی تلافی نہیں ہے یہ
انساں سے تجھ کو پیار ہے کافی نہیں ہے یہ
تجدیدِ وعدہ ہائے گذشتہ بجا، مگر
یہ تو نہیں کہ وعدہ خلافی نہیں ہے یہ
اس طرح میرے جُرم سے نظریں چُرا نہ لے
لگتا ہے اک سزا ہے معافی نہیں ہے یہ
تو اور مجھ کو بزم میں اذنِ کلام دے
کیا تیری مصلحت کے منافی نہیں ہے یہ



اسی سبب سے ہیں شاید، عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

سمجھ سکے تو سمجھ، زندگی کی اُلجھن کو
سوال اُتنے نہیں ہیں، جواب جتنے ہیں



رنج و غم مانگے ہے اندوہ و بلا مانگے ہے
دل وہ مجرم ہے جو خود اپنی سزا مانگے ہے

چُپ ہے ہر زخمِ گلو، چُپ ہے شہیدوں کا لہو
دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صِلا مانگے ہے

تو بھی اک دولت نایاب ہے، پر کیا کہیے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے

کھوئی کھوئی یہ نگاہیں، یہ خمیدہ پلکیں
ہاتھ اٹھائے کوئی جس طرح دعا مانگے ہے

راس اب آئے گی اشکوں کی نہ آہوں کی فضا
آج کا پیار نئی آب و ہوا مانگے ہے

بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی، چیخ سہی
ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

لاکھ منکر سہی پر ذوقِ پرستش میرا
آج بھی کوئی صنم، کوئی خدا مانگے ہے

سانس ویسے ہی زمانے کی رُکی جاتی ہے
وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہے
دل ہر اک حال سے بیگانہ ہوا جاتا ہے
اب توجہّ، نہ تغافل، نہ ادا مانگے ہے



وہ آنکھ ابھی دل کی کہاں بات کرے ہے
کمبخت ملے ہے تو سوالات کرے ہے

وہ لوگ جو دیوانۂ آدابِ وفا تھے
اس دَور میں تو اُن کی کہاں بات کرے ہے

کیا سوچ ہے، میں رات میں کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے، جو مجھ سے سوالات کرے ہے

کچھ جس کی شکایت ہے نہ کچھ جس کی خوشی ہے
یہ کون سا برتاؤ مرے سات کرے ہے

دم سادھ لیا کرتے ہیں تاروں کے مدھر راگ
جب رات گئے تیرا بدن بات کرے ہے

ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے
برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے



چونک چونک اٹھتی ہے محلوں کی فضا رات گئے
کون دیتا ہے یہ گلیوں میں صدا رات گئے

یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دُنیا
اُوڑھ لیتی ہے طلسموں کی رِدا رات گئے

چُبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بندِ قبا رات گئے

آؤ، ہم جسم کی شمعوں سے اُجالا کرلیں
چاند نکلا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے

تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے
سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے

دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس
دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتا رات گئے

بھیگی بھیگی ہوئی موسم کی ہواؤں پہ نہ جا
دل پہ برسے گی شراروں کی گھٹا رات گئے

اب بھی آتی ہے تری یاد مگر کچھ ایسے
ٹمٹمائے کسی جنگل میں دِیا رات گئے

گھر میں پی لیں بھی تو کیا، آج بھی یاد آتی ہے
فرشِ مے خانہ پہ وہ لغزشِ پا رات گئے

پھیل جاتا ہے اُفق تا بہ اُفق میرا وجود
مجھ سے بھر جاتے ہیں یہ ارض و سما رات گئے

جاگ اٹھتی ہے مرا شعر، مرا فن بن کے
خود مری روح کی پاکیزہ نوا رات گئے



اُفق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

ہمارے شہر میں بے چہرا لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

چلو کہ اپنی محبّت سبھی کو بانٹ آئیں
ہر ایک پیار کا بھوکا دکھائی پڑتا ہے

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص تک مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

لچک رہی ہیں شعاعوں کی سیڑھیاں پیہم
فلک سے کوئی اُترتا دکھائی پڑتا ہے

چمکتی ریت پہ یہ غسلِ آفتاب ترا
بدن تمام سُنہرا دکھائی پڑتا ہے



زمانہ آج نہیں ڈگمگا کے چلنے کا
سنبھل بھی جا کہ ابھی وقت ہے سنبھلنے کا

بہار آئے چلی جائے پھر چلی آئے
مگر یہ درد کا موسم نہیں بدلنے کا

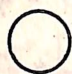
یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہم
مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا

پھرے ہیں راتوں کو آوارہ ہم، تو دیکھا ہے
گلی گلی میں سماں چاند کے نکلنے کا

تمام نشّۂ ہستی، تمام کیفِ وجود
وہ ایک لمحہ ترے جسم کے پگھلنے کا

سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

ہمیں تو اتنا پتا ہے کہ جب تلک ہم ہیں
رواجِ چاک گریباں نہیں بدلنے کا



مزاجِ رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں
"زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں"

تمام عمر کی نظّارگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں

کوئی جنوں نہ رہا جب تو زندگی کیا ہے
وہ مر گیا ہے جو کچھ بھی سنبھل گیا ہے میاں

بس ایک موجِ تہ آب کیا تڑپ اُٹھی
لگا کہ سارا سمندر اُچھل گیا ہے میاں

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجا دہل گیا ہے میاں

سجے ہوئے ہیں کھلونے سبھی دوکانوں پر
نہ جانے کس پہ ترا دل مچل گیا ہے میاں

کوئی ثبوت ملے گا تو کیوں نہ مانیں گے
سُنا تو ہے کہ بُرا وقت ٹل گیا ہے میاں

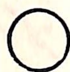
ہمارے خواب بھی بہلا نہ پائے آج ہمیں
جو رو لیے ہیں تو کچھ دل بہل گیا ہے میاں

نہ آہِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری
مزاجِ اہلِ محبّت بدل گیا ہے میاں

یہ جام جامِ طلوعِ سحر کا نظّارہ
یہ مئے ہے یا کوئی سورج پگھل گیا ہے میاں

تمھارے دل میں جواب بھی ہے کوئی بات تو ہو
ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے میاں

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں



انقلابوں کی گھڑی ہے

"نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

لوگ خاموش سے کیوں ہیں

ایسی کیا آن پڑی ہے

کبھی ایسا بھی لگا ہے

زندگی بند گھڑی ہے

کیا ہوئے رات کے راہی

راہ سنسان پڑی ہے

دو جہاں کھو نہیں جائیں

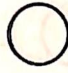
عشق کی شرط کڑی ہے

اب کہاں آنکھ میں آنسو

دھول پلکوں سے جھڑی ہے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک

ایک چادر سی پڑی ہے



رنج و غم مانگے ہے اندوہ و بلا مانگے ہے
دل وہ مجرم ہے جو خود اپنی سزا مانگے ہے

چُپ ہے ہر زخمِ گلو، چُپ ہے شہیدوں کا لہو
دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صِلا مانگے ہے

تو بھی اک دولت نایاب ہے، پر کیا کہیے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سِوا مانگے ہے

کھوئی کھوئی یہ نگاہیں، یہ خمیدہ پلکیں
ہاتھ اٹھائے کوئی جس طرح دعا مانگے ہے

راس اب آئے گی اشکوں کی نہ آہوں کی فضا
آج کا پیار نئی آب و ہوا مانگے ہے

بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی، چیخ سہی
ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

لاکھ منکر سہی پر ذوقِ پرستش میرا
آج بھی کوئی صنم، کوئی خدا مانگے ہے

سانس ویسے ہی زمانے کی رُکی جاتی ہے
وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہے
دل ہر اک حال سے بیگانہ ہوا جاتا ہے
اب توجہّ، نہ تغافل، نہ اَدا مانگے ہے



وہ آنکھ ابھی دل کی کہاں بات کرے ہے
کمبخت ملے ہے تو سوالات کرے ہے

وہ لوگ جو دیوانۂ آدابِ وفا تھے
اس دَور میں تو اُن کی کہاں بات کرے ہے

کیا سوچ ہے، میں رات میں کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے، جو مجھ سے سوالات کرے ہے

کچھ جس کی شکایت ہے نہ کچھ جس کی خوشی ہے
یہ کون سا برتاؤ مرے سات کرے ہے

دم سادھ لیا کرتے ہیں تاروں کے مدھر راگ
جب رات گئے تیرا بدن بات کرے ہے

ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے
برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے



چونک چونک اٹھتی ہے محلوں کی فضا رات گئے
کون دیتا ہے یہ گلیوں میں صدا رات گئے

یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا
اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی ردا رات گئے

چبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بندِ قبا رات گئے

آؤ، ہم جسم کی شمعوں سے اجالا کر لیں
چاند نکلا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے

تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے
سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے

دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس
دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتا رات گئے

بھیگی بھیگی ہوئی موسم کی ہواؤں پہ نہ جا
دل پہ برسے گی شراروں کی گھٹا رات گئے

اب بھی آتی ہے تری یاد مگر کچھ ایسے
ٹمٹمائے کسی جنگل میں دِیا رات گئے

گھر میں پی لیں بھی تو کیا، آج بھی یاد آتی ہے
فرشِ مے خانہ پہ وہ لغزشِ پا رات گئے

پھیل جاتا ہے اُفق تا بہ اُفق میرا وجود
مجھ سے بھر جاتے ہیں یہ ارض و سمارات گئے

جاگ اُٹھتی ہے مرا شعر، مرا فن بن کے
خود مری روح کی پاکیزہ نوا رات گئے



اُفق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

ہمارے شہر میں بے چہرا لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

چلو کہ اپنی محبّت سبھی کو بانٹ آئیں
ہر ایک پیار کا بھوکا دکھائی پڑتا ہے

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص تک مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

لچک رہی ہیں شعاعوں کی سیڑھیاں پیہم
فلک سے کوئی اُترتا دکھائی پڑتا ہے

چمکتی ریت پہ یہ غسلِ آفتاب ترا
بدن تمام سُنہرا دکھائی پڑتا ہے



زمانہ آج نہیں ڈگمگا کے چلنے کا
سنبھل بھی جا کہ ابھی وقت ہے سنبھلنے کا

بہار آئے چلی جائے پھر چلی آئے
مگر یہ درد کا موسم نہیں بدلنے کا

یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہم
مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا

پھرے ہیں راتوں کو آوارہ ہم، تو دیکھا ہے
گلی گلی میں سماں چاند کے نکلنے کا

تمام نشۂ ہستی، تمام کیفِ وجود
وہ ایک لمحہ ترے جسم کے پگھلنے کا

سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

ہمیں تو اتنا پتا ہے کہ جب تلک ہم ہیں
رواجِ چاکِ گریباں نہیں بدلنے کا



مزاجِ رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں
"زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں"

تمام عمر کی نظّارگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں

کوئی جنوں نہ رہا جب تو زندگی کیا ہے
وہ مر گیا ہے جو کچھ بھی سنبھل گیا ہے میاں

بس ایک موجِ نہ آب کیا تڑپ اُٹھی
لگا کہ سارا سمندر اُچھل گیا ہے میاں

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجا دہل گیا ہے میاں

سجے ہوئے ہیں کھلونے سبھی دوکانوں پر
نہ جانے کس پہ ترا دل مچل گیا ہے میاں

کوئی ثبوت ملے گا تو کیوں نہ مانیں گے
سُنا تو ہے کہ بُرا وقت ٹل گیا ہے میاں

ہمارے خواب بھی بہلا نہ پائے آج ہمیں
جو رو لیے ہیں تو کچھ دل بہل گیا ہے میاں
نہ آہِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری
مزاجِ اہلِ محبّت بدل گیا ہے میاں
یہ جام جامِ طلوعِ سحر کا نظّارہ
یہ مئے ہے یا کوئی سورج پگھل گیا ہے میاں
تمہارے دل میں جواب بھی ہے کوئی بات تو ہو
ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے میاں
میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں



انقلابوں کی گھڑی ہے

"نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

لوگ خاموش سے کیوں ہیں

ایسی کیا آن پڑی ہے

کبھی ایسا بھی لگا ہے

زندگی بند گھڑی ہے

کیا ہوئے رات کے راہی

راہ سنسان پڑی ہے

دو جہاں کھو نہیں جائیں

عشق کی شرط کڑی ہے

اب کہاں آنکھ میں آنسو

دھول پلکوں سے جھڑی ہے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک

ایک چادر سی پڑی ہے

روح کی پیاس کے آگے
جسم کی پیاس بڑی ہے
رات رستے سے ہٹے بھی
صبح آنے کو کھڑی ہے



زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے
کس عقیدے کی دُھائی دیجیے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے
کیا پتا پہنچیں گے کب منزل تلک
گھٹتے بڑھتے فاصلوں کا سات ہے



وہ خیال و خواب کی رعنائیاں جاتی رہیں
جن کو چھو لیتے تھے، وہ پرچھائیاں جاتی رہیں
وہ "ندیم و مطرب و ساقی"، کہاں گُم ہو گیا
خلوتوں کی انجمن آرائیاں جاتی رہیں
اے نگاہِ یار! تیری مقدرت کو کیا ہوا
دل سے کیوں زخموں کی وہ گہرائیاں جاتی رہیں



دھیرے دھیرے عشق کی نظروں میں نرمی آگئی
رفتہ رفتہ حُسن کی خوابیدگی بڑھتی گئی

زندگی ہی تشنگی ٹھہری تو اس کا کیا علاج
جس قدر پیتے گئے ہم، تشنگی بڑھتی گئی

داغ جب چمکے تو سینے میں اُجالا ہو گیا
درد جب جاگا تو دل میں چاندنی بڑھتی گئی

ہم نے جو اپنے لہو سے کل جلائے تھے چراغ
وقت کے ہمراہ اُن کی روشنی بڑھتی گئی

جیسے جیسے زندگی پیچیدہ تر ہوتی گئی
آدمی کی اور بھی بے چارگی بڑھتی گئی

اِن حسینانِ جہاں سے اور تو کیا مل سکا
ہاں، مگر اتنا کہ اپنی خوش دِلی بڑھتی گئی



دل کو ہر لمحہ بچاتے رہے جذبات سے ہم
اتنے مجبور رہے ہیں کبھی حالات سے ہم

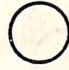
نشۂ مے سے کہیں پیاس بجھی ہے دل کی
تشنگی اور بڑھا لائے خرابات سے ہم

آج تو مل کے بھی جیسے نہ ملے ہوں تجھ سے
چونک اُٹھتے تھے کبھی تیری ملاقات سے ہم

اب تو ہر جنبشِ مژگاں کو سمجھ لیتے ہیں
پہلے واقف تھے کہاں رمز و کنایات سے ہم

عشق میں آج بھی ہے نیم نگاہی کا چلن
پیار کرتے ہیں اسی حسن روایات سے ہم

مرکزِ دیدۂ خوبانِ جہاں ہیں بھی تو کیا
ایک نسبت بھی تو رکھتے ہیں تری ذات سے ہم



تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے

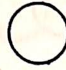
جسے نہ حُسن سے مطلب نہ عشق سے سرکار
وہ شخص مجھ کو بہت بدنصیب لگتا ہے

حدودِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر، نہ کوئی رقیب لگتا ہے

یہ دوستی، یہ مراسم، یہ چاہتیں یہ خلوص
کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے

اُفق پہ دور چمکتا ہوا کوئی تارا
مجھے چراغِ دیارِ حبیب لگتا ہے

نہ جانے کب کوئی طوفان آئے گا یارو
بلند موج سے ساحل قریب لگتا ہے



تم پہ کیا بیت گئی، کچھ تو بتاؤ یارو
میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

اِن اندھیروں سے نکلنے کی کوئی راہ کرو
خونِ دل سے کوئی مشعل ہی جلاؤ یارو

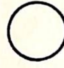
ایک بھی خواب نہ ہو جن میں وہ آنکھیں کیا ہیں
اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بساؤ یارو

بوجھ دنیا کا اُٹھاؤں گا اکیلا کب تک
ہو سکے تم سے تو کچھ ہاتھ بٹاؤ یارو

زندگی یوں تو نہ باہوں میں چلی آئے گی
غمِ دوراں کے ذرا ناز اُٹھاؤ یارو

عمر بھر قتل ہوا ہوں میں تمھاری خاطر
آخری وقت تو سولی نہ چڑھاؤ یارو

اور کچھ دیر تمھیں دیکھ کے جی لوں ٹھہرو
میری بالیں سے ابھی اُٹھ کے نہ جاؤ یارو



آنکھیں چرا کے ہم سے بہار آئے، یہ نہیں
حصّے میں اپنے صرف غبار آئے، یہ نہیں

کوئے غمِ حیات میں سب عمر کاٹ دی
تھوڑا سا وقت واں بھی گزار آئے، یہ نہیں

خود عشق قربِ جسم بھی ہے، قربِ جاں کے ساتھ
ہم دور ہی سے اُن کو پکار آئے، یہ نہیں

آنکھوں میں دل کھِلے ہوں تو موسم کی قید کیا
فصلِ بہار ہی میں بہار آئے یہ نہیں

اب کیا کریں کہ حُسن جہاں ہے عزیز ہے
تیرے سوا کسی پہ نہ پیار آئے، یہ نہیں

اکثر ترے بغیر ہمیں چین آ گیا
تو آئے تب ہی ہم کو قرار آئے، یہ نہیں

ہم سب سے پہلے قتل ہوئے، تم گواہ ہو
مرنے پہ دوسروں کو اُبھار آئے یہ نہیں

وعدوں کو خونِ دل لکھو، تب تو بات ہے
کاغذ پہ قسمتوں کو سنوار آئے یہ نہیں



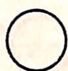
کل کہاں تھی اُن کی آنکھوں میں مروّت اِس قدر
آج کیوں کرنے لگے ہم سے محبّت اِس قدر

جانتے ہوں یا نہ ہوں، پہچاننا مشکل نہیں
ملتی جُلتی ہے ہر اک قاتل کی صورت اس قدر

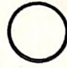
ہر کسی فٹ پاتھ پر چپ چاپ مر سکتے ہیں ہم
کم سے کم حاصل تو ہے ہم کو اجازت اس قدر

اک تبسّم، اک نظر، اک حرف، کچھ کم تو نہیں
کون دیتا ہے کسی کے دل کی قیمت اس قدر

آج تو کچھ اور بھی بے رنگ ہے خاکِ چمن
خونِ دل! کل تک نہ تھی تیری ضرورت اس قدر



جسم کی ہر بات ہے آوارگی یہ مت کہو
ہم بھی کر سکتے ہیں ایسی شاعری یہ مت کہو
اُس نظر کی، اُس بدن کی گنگناہٹ تو سنو
ایک سی ہوتی ہر اک راگنی یہ مت کہو
ہم سے دیوانوں کے بِن، دنیا سنورتی کس طرح
عقل کے آگے ہے کیا دیوانگی، یہ مت کہو
کٹ سکی ہیں آج تک سونے کی زنجیریں کہاں
ہم بھی اب آزاد ہیں، یارو ابھی یہ مت کہو
پاؤں اتنے تیز ہیں، اُٹھتے نظر آتے نہیں
آج تھک کر رہ گیا ہے آدمی، یہ مت کہو
جتنے وعدے کل تھے اتنے آج بھی موجود ہیں
اُن کے وعدوں میں ہوئی ہے کچھ کمی یہ مت کہو
دل میں اپنے درد کی چھٹکی ہوئی ہے چاندنی
ہر کہیں پھیلی ہوئی ہے تیرگی، یہ مت کہو



وہ ہم سے آج بھی دامن کشاں چلے ہے میاں
کسی پہ زور ہمارا کہاں چلے ہے میاں

جہاں بھی تھک کے کوئی کارواں ٹھہرتا ہے
وہیں سے ایک نیا کارواں چلے ہے میاں

جو ایک سمت گماں ہے تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں

بدلتے رہتے ہیں بس نام اور تو کیا ہے
ہزاروں سال سے اک داستاں چلے ہے میاں

یقیں نہیں ہے تو اہلِ یقیں کی بات نہ کر
نظر اُٹھائیں تو کوہِ گراں چلے ہے میاں

ہر اک قدم ہے نئی آزمائشوں کا ہجوم
تمام عمر کوئی امتحاں چلے ہے میاں

وہیں پہ گھومتے رہنا تو کوئی بات نہیں
زمیں چلے ہے تو آگے کہاں چلے ہے میاں

ہماری آنکھوں میں اک چاندنی اُترتی ہے
جہاں بھی تذکرۂ مہ رُخاں چلے ہے میاں

وہ ایک لمحۂ حیرت کہ لفظ ساتھ نہ دیں
"نہیں" چلے ہے نہ ایسے میں "ہاں" چلے ہے میاں



اچھا ہے اُن سے کوئی تقاضا کیا نہ جائے
اپنی نظر میں آپ کو رسوا کیا نہ جائے

ہم ہیں ترا خیال ہے تیرا جمال ہے
اک پل بھی اپنے آپ کو تنہا کیا نہ جائے

اُٹھنے کو اُٹھ تو جائیں تری انجمن سے ہم
پر تیری انجمن کو بھی سونا کیا نہ جائے

اُن کی روش جُدا ہے، ہماری روش جُدا
ہم سے تو بات بات پہ جھگڑا کیا نہ جائے

ہر چند اعتبار میں دھوکے بھی ہیں، مگر
یہ تو نہیں کسی پہ بھروسا کیا نہ جائے

لہجہ بنا کے بات کریں اُن کے سامنے
ہم سے تو اس طرح کا تماشا کیا نہ جائے

انعام ہو، خطاب ہو ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے

اِس وقت ہم سے پوچھ نہ غم روزگار کے
ہم سے ہر ایک گھونٹ کو کڑوا کیا نہ جائے



کیا غم اگر تُلی ہیں سنانیں تُلی رہیں
ہر موڑ پر کفن کی دوکانیں کُھلی رہیں

اوجھل نظر سے غم کی لطافت نہ ہو کبھی
اچھا ہے آنسوؤں سے جو آنکھیں دُھلی رہیں

دو چار گھونٹ تلخ جو ہیں، تلخ ہی سہی
کچھ تلخیاں جو ان لہو میں گھُلی رہیں

تھک کر نہ انتظار سے بازو سمیٹ لے
باہیں جو کھول دی ہیں تو باہیں کُھلی رہیں



لمحے لمحے کی سیاست پہ نظر رکھتے ہیں
ہم سے دیوانے بھی دنیا کی خبر رکھتے ہیں

اتنے سادہ بھی نہیں ہم کہ بھٹک کر رہ جائیں
کوئی منزل نہ سہی، راہ گذر رکھتے ہیں

مار ہی ڈالے جو بے موت، یہ دنیا وہ ہے
ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہُنر رکھتے ہیں

رات ہی رات ہے، باہر کوئی جھانکے تو سہی
یوں تو آنکھوں میں سبھی خواب سحر رکھتے ہیں

ہم سے اس درجہ تغافل بھی نہ برتو صاحب
ہم بھی کچھ اپنی دُعاؤں میں اثر رکھتے ہیں



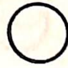
ایک ہے زمین تو سمت کیا، حدود کیا
روشنی جہاں بھی ہو، روشنی کا ساتھ دو

خود جنونِ عشق بھی اب جنوں نہیں رہا
ہر جنوں کے سامنے آگہی کا ساتھ دو

ہر خیال و خواب ہے کل کی جنّتیں لیے
ہر خیال و خواب کی تازگی کا ساتھ دو

چھا رہی ہیں ہر طرف ظلمتیں تو غم نہیں
روح میں کھلی ہوئی چاندنی کا ساتھ دو

کیا بتوں کا واسطہ، کیا خدا کا واسطہ
آدمی کے واسطے آدمی کا ساتھ دو



آسودگی کی جان اگر ہے تو گاؤں میں
شہروں کا زہر گھول نہ دینا ہواؤں میں

بیلا ہو، کیتکی ہو کہ چمپا کہ چاندنی
ہر پھول سے قریب تھے ہم اپنے گاؤں میں

یہ لہر لہر زلف تری پنڈلیوں تلک
کیوں اس طرح بدن کو چھپائے لتاؤں میں

شاید ہمارا نام و نسب یاد ہو انھیں
صدیاں جو سو رہی ہیں اندھیری گپھاؤں میں

اب کیا جنونِ دشت نوردی سے واسطہ
زنجیر ڈال لی ہے دِوانوں نے پاؤں میں

میرے بھی ہاتھ قطع ہیں تیرے بھی ہاتھ شل
اس لاش کو اُٹھا کے رکھے کون چھاؤں میں

ہم عشق کر کے مفت میں بدنام ہو گئے
ورنہ شمار اپنا بھی تھا دیوتاؤں میں



اب شہر میں جینے کے بھی اسباب رہے نا
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے سے بجھے نا

تو مجھ کو کوئی راز لگے سر سے قدم تک
سوچوں کہ یہ کیا راز ہے، کچھ راز کھلے نا

دیکھی ہے محبت بھی کبھی سنگ دلوں میں
ایسا نہیں پتّھر پہ کوئی پھول کھلے نا

لہجے کا کرشمہ ہے کہ آواز کا جادو
وہ بات بھی کہہ جائے، مرا دل بھی دکھے نا

کچھ رنگ تھے خوابوں کے جو اشکوں میں نہ ٹھہرے
کچھ رنگ ہیں ایسے بھی جو پلکوں سے چھٹے نا

غم ہجر کا ہم ہجر کے ماروں سے تو پوچھو
دن چاہے گزر جائے مگر رات کٹے نا

تو ہی مری آنکھوں کے لیے حدِّ نظر ہے
دیکھا مری نظروں نے کبھی تجھ سے پرے نا

سو بار کے دُہرائے ہوئے لفظ نہ دُہرا
الفاظ ہوں بے جان تو کچھ بات بنے نا
میں اُس سے نگاہیں تو ہٹانے کو ہٹا لوں
پر، سوچ رہا ہوں کہ بُرا اُس کو لگے نا
شاید کہ یہ دل غم کے اندھیرے سے بہل جائے
اچھا ہے جو اِس رات کوئی شمع جلے نا
سوچا تھا، چلو پیاس بجھے زہر ہی پی لیں
پر زہر ملے تب تو کوئی زہر پیے نا



ہر دھندلکے میں کئی نقش نظر آتے ہیں
شمع جلتی ہے تو تصویر بدل جاتی ہے

فرق کچھ بھی نظر آتا نہیں زندانوں میں
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

چند وہموں پہ نہ رکھ فکر و عمل کی بنیاد
صرف بنیاد سے تعمیر بدل جاتی ہے

دل نہ بدلیں گے تو حالات بدلنے سے رہے
دل بدل جانے سے تقدیر بدل جاتی ہے



زندگی تجھ کو بُھلایا ہے بہت دن ہم نے
وقت خوابوں میں گنوایا ہے بہت دن ہم نے

اب یہ نیکی بھی ہمیں جُرم نظر آتی ہے
سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے

تم بھی اِس دل کو دُکھا لو تو کوئی بات نہیں
اپنا دل آپ دُکھایا ہے بہت دن ہم نے

مدّتوں ترکِ تمنّا پہ لہو رویا ہے
عشق کا قرض چکایا ہے بہت دن ہم نے

کیا پتا ہو بھی سکے اِس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے



مانا کہ رنگ رنگ ترا پیرہن بھی ہے
پر، اس میں کچھ کرشمۂ عکسِ بدن بھی ہے

عقلِ معاش و حکمتِ دنیا کے باوجود
ہم کو عزیز عشق کا دیوانہ پن بھی ہے

مُطرب بھی تو، ندیم بھی تو، ساقیہ بھی تو
تو جانِ انجمن ہی نہیں، انجمن بھی ہے

بازو چھوا جو تو نے، تو اُس دن کُھلا یہ راز
تو صرف رنگ و بو ہی نہیں ہے بدن بھی ہے

اپنا تو تجربہ ہے بہت مختلف، مگر
سُنتے ہیں شہرِ دل میں وفا کا چلن بھی ہے

یہ دور کس طرح سے کٹے گا پہاڑ سا!
یارو! بتاؤ ہم میں کوئی کوہکن بھی ہے



مجھے معلوم ہے، میں ساری دنیا کی امانت ہوں
مگر وہ لمحہ، جب میں صرف اپنا ہو سا جاتا ہوں

میں تم سے دور رہتا ہوں تو میرے ساتھ رہتی ہو
تمھارے پاس آتا ہوں تو، تنہا ہو سا جاتا ہوں

میں چاہے سچ ہی بولوں ہر طرح سے اپنے بارے میں
مگر تم مسکراتی ہو تو جھوٹا ہو سا جاتا ہوں

ترے گلرنگ ہونٹوں سے دہکتی زندگی پی کر
میں پیاسا اور پیاسا اور پیاسا ہو سا جاتا ہوں

تجھے باہوں میں بھر لینے کی خواہش یوں اُبھرتی ہے
کہ میں اپنی نظر میں آپ رسوا ہو سا جاتا ہوں



لمحہ لمحہ تری یادیں جو چمک اُٹھتی ہیں
ایسا لگتا ہے کہ اُڑتے ہوئے پل جلتے ہیں
میرے خوابوں میں کوئی لاش اُبھر آتی ہے
بند آنکھوں میں کئی تاج محل جلتے ہیں



تمام عمر عذابوں کا سلسلہ تو رہا
یہ کم نہیں، ہمیں جینے کا حوصلہ تو رہا
گزر ہی آئے کسی طرح تیرے دیوانے
قدم قدم پہ کوئی سخت مرحلہ تو رہا
چلو نہ عشق ہی جیتا، نہ عقل ہار سکی
تمام وقت مزے کا مقابلہ تو رہا
میں تیری ذات میں گم ہو سکا نہ تو مجھ میں
بہت قریب تھے ہم، پھر بھی فاصلہ تو رہا
روش روش پہ جو کانٹے مہک اُٹھے بھی تو کیا
چمن سے دور گلابوں کا قافلہ تو رہا
یہ اور بات کہ ہر چھیڑ لاأبالی تھی
تیری نظر کا دلوں سے معاملہ تو رہا
بہت حسین سہی وضعِ احتیاط تری
مری ہوس کو ترے پیار سے گلہ تو رہا



ہر ایک شخص پریشاں و "دربدر" سا لگے
یہ شہر مجھ کو تو یارو! کوئی بھنور سا لگے

کسے پتا ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے

اب اُس کے طرزِ تجاہل کو کیا کہے کوئی
وہ بے خبر تو نہیں، پھر بھی بے خبر سا لگے

نشاطِ صحبتِ رنداں بہت غنیمت ہے
کہ لمحہ لمحہ پُر آشوب و پُر خطر سا لگے

ہر ایک غم کو خوشی کی طرح برتنا ہے
یہ دور وہ ہے کہ جینا بھی اک ہُنر سا لگے

تیری زبان کا کیا اعتبار ہے، لیکن
تری نگاہ کا ہر قول معتبر سا لگے

وہ تند وقت کی رد ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکیں
ہر آدمی کوئی اُکھڑا ہوا شجر سا لگے

جہانِ نو کے مکمّل سنگھار کی خاطر
صدی صدی کا زمانہ بھی مختصر سا لگے



طلوعِ صبح ہے، نظریں اُٹھا کے دیکھ ذرا
شکستِ ظلمتِ شب مسکرا کے دیکھ ذرا

غمِ بہار و غمِ یار ہی نہیں سب کچھ
غمِ جہاں سے بھی دل کو لگا کے دیکھ ذرا

بہار کون سی سوغات لے کے آئی ہے
ہمارے زخمِ تمنّا تو آ کے دیکھ ذرا

ہر ایک سمت سے اک آفتاب اُبھرے گا
چراغِ دیر و حرم تو بُجھا کے دیکھ ذرا

وجودِ عشق کی تاریخ کا پتہ تو چلے
ورق اُلٹ کے تو ارض و سما کے دیکھ ذرا

ملے تو، تو ہی ملے اور کچھ قبول نہیں
جہاں میں حوصلے اہلِ وفا کے دیکھ ذرا

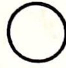
تری نظر سے ہے رشتہ مرے گریباں کا
کدھر ہے میری طرف مسکرا کے دیکھ ذرا



ہر لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے
یہ طرز، یہ اندازِ سخن ہم سے چلا ہے

ارمان ہمیں ایک رہا ہو، تو کہیں بھی
کیا جانے یہ دل کتنی چتاؤں میں جلا ہے

اب جیسا بھی چاہیں جسے حالات بنا دیں
ہے یوں کہ کوئی شخص بُرا ہے نہ بھلا ہے



آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایا کوئی لہرائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے، لچک جائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو

رستے کے دھندلکے میں کسی موڑ پہ کچھ دور
اک لو سی چمک جائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو

صندل سے مہکتی ہوئی پُرکیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندّی کوئی بل کھائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب رات گئے کوئی کرن، میرے برابر
چپ چاپ سے سو جائے، تو لگتا ہے کہ تم ہو



تمہارے جشن کو، جشنِ فروزاں ہم نہیں کہتے
لہو کی گرم بوندوں کو چراغاں ہم نہیں کہتے

اگر حد سے گزر جائے دوا تو بن نہیں جاتا
کسی بھی درد کو دنیا کا درماں ہم نہیں کہتے

نظر کی انتہا کوئی، نہ دل کی انتہا کوئی
کسی بھی حُسن کو، حُسنِ فراواں ہم نہیں کہتے

کسی عاشق کے شانے پر بکھر جائے تو کیا کہنا
مگر اُس زلف کو، ،، زلفِ پریشاں" ہم نہیں کہتے

نہ بوئے گل مہکتی ہے، نہ شاخِ گل لچکتی ہے
ابھی اپنے گلستاں کو گلستاں، ہم نہیں کہتے

بہاروں سے جنوں کو ہر طرح نسبت سہی لیکن
شگفتِ گل کو عاشق کا گریباں ہم نہیں کہتے

ہزاروں سال بیتے ہیں، ہزاروں سال بیتیں گے
بدل جائے گی کل تقدیرِ انساں ہم نہیں کہتے



زمیں ہو گی کسی قاتل کا داماں، ہم نہ کہتے تھے
اکارت جائے گا خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے

علاجِ چاکِ پیراہن ہوا تو اِس طرح ہو گا
سیا جائے گا کانٹوں سے گریباں ہم نہ کہتے تھے

ترانے، کچھ دے ئے نفظوں میں خود کو قید کریں گے
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے

کوئی اتنا نہ ہو گا لاش بھی لے جا کے دفنا دے
اِنھیں سڑکوں پہ مر جائے گا انساں ہم نہ کہتے تھے

نظر لپٹی ہے شعلوں میں، لہو تپتا ہے آنکھوں میں
اُٹھا ہی چاہتا ہے کوئی طوفاں ہم نہ کہتے تھے

چھلکتے جام میں بھیگی ہوئی آنکھیں اُتر آئیں
ستائے گی کسی دن یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

نئی تہذیب کیسے لکھنؤ کو راس آئے گی
اُجڑ جائے گا یہ شہرِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے



لاکھ آوارہ سہی، شہروں کے فٹ پاتھوں پہ ہم
لاش یہ کس کی لیے پھرتے ہیں ان ہاتھوں پہ ہم
اب اُنھیں باتوں کو سنتے ہیں تو آتی ہے ہنسی
بے طرح ایمان لے آئے تھے جن باتوں پہ ہم
کوئی بھی موسم ہو، دل کی آگ کم ہوتی نہیں
مفت کا الزام رکھ دیتے ہیں برساتوں پہ ہم
زلف سے چھنتی ہوئی اُس کے بدن کی تابشیں
ہنس دیا کرتے تھے اکثر چاندنی راتوں پہ ہم
اب انھیں پہچانتے بھی شرم آتی ہے ہمیں
فخر کرتے تھے کبھی جن کی ملاقاتوں پہ ہم



اب دل کے کہاں گردوہ مہتاب رہے ہیں
پلکوں پہ سُلگتے ہوئے کچھ خواب رہے ہیں

طوفانِ حوادث سے ڈراتا ہے ہمیں کیا
ہم لوگ تو اکثر تہہِ گرداب رہے ہیں

بے وجہ تو بیتاب نہ پہلے تھے نہ اب ہیں
بے تاب رکھا تم نے تو بے تاب رہے ہیں

دنیائے سیاست ہو کہ دنیائے ادب ہو
دیوانے تو ہر حال میں نایاب رہے ہیں



جائیے، بیٹھئے حکمرانوں کے بیچ
آپ کیوں آ گئے ہم دوانوں کے بیچ

اور کیا ہے سیاست کے بازار میں
کچھ کھلونے سجے ہیں دُکانوں کے بیچ

تھا جنھیں عشق کا حوصلہ اُٹھ گئے
تذکرے رہ گئے داستانوں کے بیچ

عشق کے نام پر اور تو کیا ہوا
دشمنی ہو گئی دو گھرانوں کے بیچ

لوگ باتیں بنانے پہ ایسے تُلے
چھپ گئی ہر حقیقت فسانوں کے بیچ

جلنے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں
اک دھواں ہے ابھی تک مکانوں کے بیچ

زندگانی کی قدریں بدلنے لگیں
لوگ بٹنے لگے دو زمانوں کے بیچ

کم سے کم ہم میں یہ حوصلہ تو رہا
زندگی کاٹ دی امتحانوں کے بیچ
پاؤں تحت الثریٰ میں اُترتے گئے
ذہن اُڑتا رہا آسمانوں کے بیچ
شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں، کچھ نوجوانوں کے بیچ



بھولے نہ کسی حال میں آدابِ نظر ہم
مڑ کر نہ تجھے دیکھ سکے وقتِ سفر ہم

اے حسن! کسی نے تجھے اتنا تو نہ چاہا
برباد ہوا تیرے لیے کون، مگر ہم

جینے کا ہمیں خود نہ ملا وقت تو کیا ہے
لوگوں کو سکھاتے رہے جینے کا ہنر ہم

اب تیرے تعلق سے ہمیں یاد ہے اتنا
اک رات کو مہمان رہے تھے ترے گھر ہم

دنیا کی کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں جو خوابِ سحر ہم

وہ کونسی آہٹ تھی جو خوابوں میں در آئی
کیا جانیے کیوں چونک پڑے پچھلے پہر ہم

---

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی